نظم 'شکوہ' کا تجزیاتی و موضوعاتی مطالعہ

ڈاکٹر شمیم احمد

سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اقبال روایت شناس شاعر تھے اور روایت شکن بھی۔ روایتیں جب قلب و نظر کا حصہ بن جاتی ہیں تو انسانی بصیرت انھیں آگے بڑھاتی ہے، انھیں ترقی اور بلندی عطا کرتی ہے۔ بلندی کے اس سفر سے پرانی روایتیں ترک ہوتی ہیں اور نئی روایتیں وجود میں آتی ہیں، لیکن یہ نئی روایتیں بالکل نئی نہیں ہوتیں بلکہ ان کی جڑیں پرانی روایتوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ اقبال کا تمام کلام انہی نئی اور پرانی روایتوں کے بین بین سفر کرتا ہے اور اپنی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ غالب کے الفاظ میں ایسے موحّد ہیں جن کا کیش ترکِ رسوم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ملتیں جب اپنی انا کی تسخیر کے عمل سے گزرتی ہیں تو جزو ایماں بن جاتی ہیں۔ اسلام محض بدنی اور روحانی عبادات کا نام نہیں، یہ محض اپنی انفرادی زندگی کو جلا بخشنے کی غرض سے ذکرِ الٰہی میں مشغول ہونے کا نام نہیں، اسلام اجتماعی زندگی میں شریک ہونے اور تمام انسانوں کی زندگی کو منور کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ اقبال کو احساس ہے کہ روحِ بلالی گر نہ ہو تو اذان محض ایک رسم ہے اور اسلام یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس کی طے کردہ عبادات کو رسم سمجھ کر ادا نہ کیا جائے بلکہ انھیں تطہیر قلب کا ذریعہ بنایا جائے۔

جمعیتِ خاطر پریشانی میں مبتلا اقبال خود کو ایک ایسا بلبل سمجھتے ہوئے جواب تک محوِ ترنم ہے اور جس کے سینے میں اب تک نغموں کا تلاطم ہے روایت شکنی کا ایسا حوصلہ مجتمع کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ خدا سے شکوہ کر سکیں۔ اس شکوے کا اظہار ایک نظم کی صورت میں ہوا اور اپریل ۱۹۱۱ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں یہ نظم پڑھ کر سنائی گئی۔ یہ جلسہ ریواز ہوسٹل اسلامیہ کالج کے صحن میں منعقد ہوا تھا۔ نظم خلافِ معمول پہلے سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ اس کے برعکس نظم کا مسودہ خریدنے کے لیے لوگوں نے خوب بڑھ چڑھ کر بولیاں لگائی تھیں۔ بعد میں یہ نظم پنجاب ریویو، ماہنامہ مخزن اور دوسرے جرائد میں شائع ہوئی۔

نظم مسدس کی ہیئت میں ہے۔ چھ چھ مصرعوں پر مشتمل بند میں ابتدائی چار مصرعے ایک قافیہ اور ردیف میں ہیں اور آخری دو مصرعے نئے قافیے اور ردیف کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ اس سے نظم کے آہنگ اور ترنم میں اضافہ ہوتا ہے۔ نظم میں کل اکتیس بند ہیں۔

نظم کی ابتدا میں اقبال کا مزاج اور آہنگ سرشاری اور سربلندی کی جانب آمادہ ہے۔ وہ انتہائی پراعتماد لہجے میں کسی روٹھے ہوئے نوجوان کی طرح سوال کرتے ہیں کہ دوسری قوموں کے لوگ اپنی اصل رقم پر خوب سود کماتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ دولت مند ہوتے چلے جاتے ہیں جبکہ مسلمان قوم کو اس بات کی اجازت نہیں۔ اس لیے مسلمان اپنی اصل رقم پر سود نہیں لیتے اور نقصان کیے جاتے ہیں۔ انھیں یہ تلقین کی گئی ہے کہ مستقبل کی تیاری کے بجائے آج کو سنوارنے میں دلچسپی لیں۔ سوال یہ ہے کہ ان حدود کی پابندی صرف مسلمانوں تک کیوں محدود ہے اور یہ سوالات صرف اقبال کے ذہن میں سر نہیں ابھارتے بلکہ قوم کے نوجوانوں کا یہ شکوہ اقبال کے کانوں تک اکثر پہنچتا رہتا ہے۔ اس لیے اقبال قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنی جرأت اور حوصلے کو آزماتے ہیں اور اللہ سے شکوہ کرنے کا بڑا کام اپنے ذمہ لیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ سوائے خاکم بدہن، یعنی منھ میں خاک کے اور کچھ نہیں۔ چوں کہ اقبال کو اپنی جرأت آموزی کا اندازہ ہے اس لیے اگلے بند میں ان کا لہجہ چڑچڑے پن کے بجائے مصالحانہ انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے اپنی مجبوری کا حوالہ دے کر درخواست کرتے ہیں کہ خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے۔

خود خوگرِ حمد قرار دے کر اقبال نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ یہ عقیدے پر قائم ایک مومن کا مالکِ حقیقی سے شکوہ ہے۔ یہ ایسا شکوہ نہیں ہے جس میں عقیدے و ایمان کو ترک کرنے کا شائبہ بھی ہو۔ وہ تو بس اپنے ذہن میں آنے والے سوالات کے اظہار کے خواہش مند ہیں۔ شاعر کا حساس دل اپنے جذبات و احساسات کو خود تک محدود رکھنے پر قادر نہیں۔ وہ سراپا سوال بن کر اپنے خالق کے آگے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ اظہار سوال سے ان کی بے قراری میں کمی آئے گی۔ بارگاہِ ایزدی سے کوئی ایسا اشارہ موصول ہوگا جو راہ نمائی کا سبب بنے گا۔ اکثر دکھ اور تکلیف کا اظہار ان میں کمی کا باعث بنتا ہے ورنہ باطنی گھٹن انسان کے لیے مزید ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے۔ اقبال اس اندرونی بوجھ کے ساتھ آگے نہیں بڑھنا چاہتے۔ ان کی خواہش ہے کہ اس کا مداوا یہیں ہو جائے۔ سچ بات یہ ہے کہ اقبال کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ ہمیں یہ رہنمائی عطا کرتا ہے کہ اس نظم میں اپنے شکوک و شبہات

کے اظہار کے بعد اقبال یقین و ایمان کے اعلیٰ مقامات سے سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد ان کی زبان سے اس طرح کے شکوے اور شکایات کا اظہار نہ ہوا کیوں کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ جس زمانے میں اقبال نے نظم 'شکوہ' کہی اس وقت ان کے ایمان و یقین میں کسی قسم کی کمی تھی۔ ایمان کے کئی مدارج ہیں۔ وہ شکوہ کے اظہار کے وقت بھی اعلیٰ درجہ پر تھے۔ اسی یقین و خود اعتمادی کے باعث انھیں یہ ہمت ملی کہ وہ قرونِ اولیٰ کے حوالے دیں اور صحابۂ کرامؓ کی قربانیوں کی یاد دلا کر اُمّت کی موجودہ زبوں حالی کی وجوہات تلاش کریں۔ چنانچہ تیسرے بند سے اگلے گیارہ بند تک علامہ اقبال نے مسلمانوں کی قوت بازو اور جذبۂ ایمانی کو موضوع بنایا ہے۔ ان تمام معرکوں کو یاد کیا ہے جن کے سبب توحید کے نقوش ہر دل پر مرتسم ہوئے۔ ورنہ اس سے قبل دنیا کی حالت یہ تھی:

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام تیرا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

اقبال نے دنیا کی نامور اور معروف قوموں کے ساتھ مسلم قوم کا موازنہ کیا ہے کہ سلجوق، تورانی، چینی، ایرانی، ساسانی اور یونانی قومیں یہاں ایک زمانے سے آباد تھیں۔ یہ وہ قومیں ہیں جنھوں نے اپنی دانشوری اور انتظامِ مملکت کے سبب شہرت حاصل کی۔ ان کے علاوہ یہودی اور نصرانی قومیں بھی یہیں آباد تھیں جن پر خدا کا خصوصی فضل نازل ہوا تھا۔ ان میں سے کسی قوم میں ذمہ داری کا یہ احساس پیدا نہیں ہوا کہ وہ اپنے مالک حقیقی کے نام پر تلوار اٹھائے۔ جس کسی نے بھی جنگ کی، مقابلہ آرائی کی اور انسانوں کا خون بہایا، اُس کا مقصد صرف جہانداری اور جہانبانی تھا۔ وہ اپنی خود غرضی، لالچ اور ہوس کی وجہ سے آمادۂ جنگ ہوتے تھے اور بڑی بڑی سلطنتیں قائم کر کے اپنی ہیبت دلوں پر بٹھاتے تھے۔ ان کے برعکس مسلمان وہ قوم ہے جس نے خدا کے نام پر تلوار اٹھائی، جس نے بگڑی ہوئی بات کو بنانے کی کوشش کی، خدا کے پیغام کو عام کرنے کے لیے جنگیں کیں، مقابلے کیے، وہ خود غرض نہیں تھے۔ ان کے دلوں میں یہ یقین گھر کر چکا تھا کہ حقیقی حاکم صرف ایک ہے، وہ بڑی شان والا ہے۔ اس لیے کسی جہاندار کی شان آنکھوں میں نہیں چجیتی تھی۔ بڑی سے بڑی رکاوٹ ان کے حوصلے کو پست کرنے کا باعث نہیں بن سکتی تھی۔ اقبال یاد دلاتے ہیں:

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

تلواروں کی چھاؤں میں کلمہ پڑھنا، زیرِ خنجر بھی توحید کا پیغام عام کرنا، جنگ میں کسی حال میں پسپائی اختیار نہ کرنا، تیغ ہی نہیں توپ سے لڑ جانا اور شیروں کے پاؤں میداں سے اُکھاڑ دینا اس لیے نہیں تھا کہ قوم زر و مالِ جہاں پر جان دیتی تھی وہ تو صرف خدا کے نام کی عظمت کے لیے مرتی تھی۔ اس بڑے مقصد کے حصول کے لیے اس نے بڑے بڑے بادشاہوں سے مقابلہ کیا، روم کے بادشاہ قیصر اور ایران کے بادشاہ کسریٰ کو شکست دی، درۂ خیبر کو اکھاڑ کر اپنے لیے راہ بنائی۔ باطل معبودوں کے پیکر توڑ ڈالے، یہاں تک کہ جن مندروں میں خدا کے نام پر آگ کی پوجا کی جاتی تھی انھیں بھی ٹھنڈا کر دیا۔ ایک خدا کی ہیبت اس قدر طاری ہوئی کہ خود بُت منھ کے بل گر کے ھُو اللہ احد کہنے پر مجبور ہو گئے۔

جس قوم نے ساری دنیا کو وحدانیت کا سبق سکھانے کے لیے جرأت اور حوصلے کے تمام معرکے سر کیے اس کا مقصد کسی کی توہین یا تذلیل نہیں تھا۔ وہ مقابلہ و پیکار کی زحمت میں اس لیے مبتلا نہیں ہوئی تھی کہ اس کی کوئی ذاتی غرض پوشیدہ تھی۔ یہ جہاں گیری اور جہاں داری صرف خدا کی طلب گاری کے سبب تھی۔ صرف خدا کی رضا حاصل کرنے کے مقصد سے خدا کی دنیا کو تکبیر سے بیدار کیا گیا۔ اس تمام عمل میں خیال رکھا گیا کہ خدا کے احکامات کی پابندی ہر حال میں قائم رہے۔ چنانچہ:

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

مسلمان قوم کی دلیری، بہادری، وفاداری اور جذبۂ ایمانی کے موضوع پر مشتمل دس بند کے بعد اگلے بند میں نظم اپنا رخ بدلتی ہے، اس بند کے ابتدائی چار مصرعوں میں اقبال پچھلے تمام بند کے موضوع کا اعادہ کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ صفحۂ دہر کو باطل سے مٹانے، نوعِ انسان کو غلامی سے چھڑانے، کعبے کو جبینوں سے بسانے اور قرآن کو سینے سے لگانے والی قوم پر بے وفائی کا الزام کیسے لگایا جا سکتا ہے۔ اگر اس قوم پر الزام ہے کہ اس نے وفاداری چھوڑ دی

ہے تو پھر یہ قوم بھی سوال کرنے کا اختیار رکھتی ہے:

ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

عدم دلداری کے اس شکوے کے ساتھ دوسری قوموں اور مسلم قوم کے مابین موازنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بیرسٹر اقبال سب سے بڑی عدالت میں، سب سے بڑے عادل کے سامنے اپنی قوم کی وکالت کرتے ہوئے دلیلیں دیتے ہیں کہ گناہ گاری کا سلسلہ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں، صرف مسلمانوں کی وفاداری پر سوال کیوں، جب کہ دوسری امتوں میں بھی بہت گناہ گار ہیں۔ دوسری قوموں میں ایک طرف عاجزی کے ساتھ زندگی گزارنے والے ہیں تو دوسری طرف اپنی انا اور خودغرضی کے لیے جینے والے بھی ہیں۔ ان میں بھی ایک طرف کاہل اور غافل لوگ ہیں تو دوسری طرف ہوشیار اور سمجھدار لوگ بھی ہیں اور یہی معاملہ مسلم قوم کا ہے کہ اس میں گناہ گار اور وفادار، غافل اور ہوشیار سبھی طرح کے لوگ موجود ہیں۔ تو پھر اس جانبداری کی وجہ کیا ہے:

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

مسلمانوں کی اس زبوں حالی کے سبب باقی تمام قومیں اطمینان کی سانس لیتی ہیں کہ اب خدا کی عظمت اور توحید کو تسلیم کرانے والی مسلمان قوم خود پستہ حال ہو کر حوصلہ چھوڑ بیٹھی ہے۔ مسلمانوں کی پامالی دیکھ کر یہ قومیں جشن مناتی ہیں، مذاق اڑاتی ہیں کہ قرآن کی تعلیمات کو عام کرنے کی کوشش کرنے والے مسلمان نظریں نیچی کیے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ اقبال خدا تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ توحید کی علم بردار مسلمان قوم کا مضحکہ اڑانے والے تمام نعمتوں سے سرفراز ہیں۔ ان کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ انھیں دنیا کے تمام عیش و آرام دستیاب ہیں۔ حسینائیں ان کی قدم بوسی کرتی ہیں اور بے چارہ مسلمان صرف وعدۂ حور پر اکتفا کیے بیٹھا ہے:

یہ شکایت نہیں، ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور
اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

شکوے اور شکایات کے ایک طویل سلسلے کے باوجود خوگرِ حمد اقبال کے ذہن سے بار بار ایسے مصرعے نکل آتے ہیں جو خدا کی عظمت اور بڑائی بیان کرتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ خدا کی قدرت تو وہ ہے جس کی کوئی حد ہے نہ کوئی حساب۔ وہ تو جس کو چاہے بے حساب دیتا ہے۔ اس کی رضا اگر شاملِ حال ہو تو انوکھے معجزے رونما ہوتے رہیں۔ سینۂ صحرا سے حباب پھوٹ پڑتے ہیں۔ خدا کی عظمت اور قدرت کا بیان کر کے اقبال سوال کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں دولت دنیا نایاب کیوں ہے؟ دوسری قوموں کو دولت سے نوازنے والی ذات بھی خدا کی ہے تو پھر خدا کو ماننے والے اس سے محروم کیوں ہیں؟ یہ محرومی اور ناداری اغیار کے طعن و تشنیع اور مسلمانوں کی رسوائی کا سبب بن چکی ہے۔ اس لیے دنیا میں اور دنیا کے معاملات میں انھیں وہ حصہ داری حاصل نہیں ہے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو حاصل تھی۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توحید سے دنیا خالی ہو رہی ہے۔

رسولِ اکرم حضرت محمدؐ نے جنگ بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے کہا تھا کہ اے خدا یہ مٹھی بھر جماعت آج فنا ہو گئی تو پھر قیامت تک تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اقبال اس دعا کے الفاظ کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہنے کی جسارت کرتے ہیں:

ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

مسلمانوں کے زوال کی اس داستان کا رنگ مرثیہ کا نہیں ہے جس سے افسردگی اور مایوسی طاری ہوتی۔ اقبال مسلمانوں کے خوابیدہ نفس کو جھنجھوڑنا چاہتے ہیں، اسے خوابِ غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں، اسے جتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کا مطلب کیا ہے۔ جب اقبال خدا سے شکایتاً یہ کہتے ہیں کہ ''ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے'' تو قاری یہ مصرعہ پڑھ کر اپنا محاسبہ کرتا ہے کہ کیا اُس کی زندگی اور طرزِ زندگی ویسی ہے جیسی خدا تعالیٰ کو مطلوب ہے یا ایسے طرزہائے زندگی اختیار کر لیے گئے ہیں جس میں کہیں کہیں ذاتِ خداوندی کے ساتھ اظہارِ تعلق ہو جاتا ہے اور اسی کو کافی سمجھ کر نزولِ برکات کے انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ذاتِ خداوندی سے اس لاتعلقی یا کم تعلقی کی جانب اشارہ کرنے کے لیے اقبال نے اگلے بند میں مسلمانوں کی صورتِ حال کا نقشہ کھینچا ہے کہ وہ روحانی محفلیں ہیں اور نہ روح کی گہرائیوں سے چاہنے والے، راتوں کی عبادت کا سلسلہ مفقود ہے اور صبح کے وقت کی یاد سے بھی غفلت ہے۔ اس کے برعکس قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے خدا کو اپنا دل دیا اور اس کے بدلے اپنا صلہ لے گئے۔ اُن میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جنھیں اسلام قبول کیے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ جامِ شہادت نوش فرمایا اور قبولیت کے اعلیٰ درجات سے سرفراز ہوئے۔ وعدۂ فردا پر اپنی جان قربان کر دینے والے عاشق اب مفقود ہیں۔ اب انھیں چراغِ رخِ زیبا لے کر بھی ڈھونڈو تو ایسے چاہنے والے اب کہیں نہیں ہیں۔

یہ نظم دو انتہاؤں کے بین بین سفر کرتی ہے۔ ایک انتہا تو وہ ہے کہ جس میں اقبال اسلامی تعلیمات کی رو سے سچے عاشق کا کردار اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور دوسری انتہا وہ ہے جس میں اقبال اپنے عہد کے مسلمانوں کی

وکالت کرتے ہوئے خدا سے ان کے تعلق کا ذکر کرتے ہیں اور خدا سے سوال کرتے ہیں کہ اپنے شیداؤں پہ چشمِ غضب کیوں ہے۔ آخر یہ امت بھی اسلامی شعائر سے اتنی ہی محبت رکھتی ہے جتنی پہلے کے مسلمانوں کو تھی۔ یہ امت بھی پیغمبر آخرالزماں اور ذاتِ باری تعالیٰ سے اتنی ہی انسیت اور محبت رکھتی ہے جتنی پچھلوں کو تھی۔ اس لیے اقبال مدلل طرزِ بیان اختیار کرتے ہوئے بلند بانگ لہجے میں سوالات کرتے ہیں:

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربیؐ کو چھوڑا؟
بت گری پیشہ کیا، بت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو، عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا؟
رسمِ سلمانؓ و اویس قرنیؓ کو چھوڑا؟
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں

اس انداز سے پرسش اس وقت کی جاتی ہے جب مدعی کو پورا یقین اور اعتماد ہو کہ جن بیانات کو وہ استفہامیہ لہجے میں پیش کر رہا ہے ان کا جواب سوائے 'نہیں' کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ مذکورہ بند کا ہر سوال جب قاری کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو اس کا ذہن خود بخود نہیں کی تکرار جاری رکھتا ہے، لیکن جب بات بڑھتے بڑھتے چھٹے مصرعے پر پہنچتی ہے اور اقبال یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں'' تو قاری ایک دم چونک جاتا ہے اور ایک لحظے کے لیے ذہن پھر وہی 'نہیں' کی تکرار کرتا ہے، لیکن اس مرتبہ یہ 'نہیں' اپنے باطنی احتساب کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور قاری کو احساس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی ہرگز مثلِ بلال حبشیؓ نہیں ہے۔ پھر بند کے ابتدائی چار مصرعوں کی قرأتِ نو ہر سوال کے جواب میں 'نہیں' کہنے میں تامل محسوس کرتی ہے۔ نئی قرأت سے نیا احساس سر اُبھارتا ہے کہ خدا سے تعلق میں وہ گرمجوشی رہی نہ رسولِ عربیؐ سے۔ عشق کی آشفتہ سری کا تو سوال ہی نہیں۔ ممکن ہے تکبیر کی آگ کہیں سینوں میں دبی ہو، لیکن اس کی حرارت کا اثر باہر مفقود ہے۔ نظم شکوے کے ذریعے اقبال مسلمانوں کے دلوں میں یہی احساس پیدا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اگلے ہی بند میں خود انھوں نے پہلی انتہا کی طرف رجوع کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ عشق کی پہلی سی ادا نہیں رہی اور تسلیم و رضا اور پابندیِ آئینِ وفا کے پیمانے بھی بدل گئے ہیں گویا اب مسلمانوں میں دل کا وہ اضطراب مفقود ہے جو اسے قبلہ نمائی کی صفت عطا کرتا تھا۔ اطاعت کے رنگ میں اس کمی کا اعتراف ایک سخت بات کہنے کی تمہید ثابت ہوا۔ شکوہ کناں اقبال نے اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے وفاداری کے ترازو میں دونوں طرف عدم توازن کی کیفیت کا نقشہ کھینچ دیا:

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

انتہائی نازک نکتے پر بے باکانہ اظہار کے بعد اقبال غیبی امداد اور اخلاصِ دینی کی کمی کی شکایت کرتے ہیں۔ بلاشبہ ابتدائی دور کے مسلمانوں کے دلوں میں جو ایمانی جذبہ کارفرما تھا، اُس نے انھیں اتنا حوصلہ بخشا کہ تکمیلِ دین کے عظیم کام سے عہدہ برآ ہوئے۔ اقبال شکایت کرتے ہیں کہ وہ جذبۂ ایمانی آج کے مسلمانوں کو کیوں عطا نہیں کیا گیا۔ اگلے تین بند میں اقبال مختلف اشاروں اور علامتوں کی مدد سے اپنے دل میں اٹھنے والے طوفان کی بلاخیزی پر بند لگاتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں اپنے عہد کے حالات اور مسلمانوں کی دلی کیفیت کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ یہاں شکایت سے زیادہ اداسی اور افسوس کی کیفیت کا غلبہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلند بانگ لہجے میں شکایتی انداز اختیار کرنے کے بعد اقبال کے دل کا غبار نکل گیا ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کو آن کی آن میں اس صورتِ حال کو بدلنے کی قدرت حاصل ہے۔ ضرورت ہے گڑگڑا کر دعا مانگنے کی اور اپنے حوصلوں کو بلند کرنے کی۔ چنانچہ اقبال اختتامی دعائیہ بندوں سے قبل مذکورہ تین بند میں گریز کی صورت اختیار کرتے ہیں:

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے
سنتے ہیں جام بہ کف نغمۂ کو کو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ہو بیٹھے
اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

دیوانوں کے منتظر ہو بیٹھے ہونے کی ترکیب دلوں میں خوابیدہ ایمان کو روشنی عطا کرتی ہے جس کی لو پروانوں کی خود افروزی کے لیے کافی ہوگی کہ یہی جگر سوزی قوموں کی کامیابی کی ضمانت تب بھی تھی اب بھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے وافر تھی اب کمیاب ہے، لیکن اقبال امیدیں جگانے والے شاعر ہیں۔ وہ حوصلوں کی پستی کا بیان بھی اس طرح کرتے ہیں کہ دلوں کو حوصلہ ملتا ہے۔ اپنی کمیوں کی طرف نظر جاتی ہے اور انھیں دور کرنے کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ اقبال جانتے ہیں باغ کے ہر غنچے میں بوئے نیاز مضطرب بیٹھی ہے۔ یہ سازِ تشنۂ مضراب ہے۔ ایک ضرب لگتے ہی اس ساز کے تاروں سے وہی نغمے نکلیں گے جن کے لیے اسلامی تاریخ جانی جاتی ہے۔ اس لیے اقبال اللہ تعالیٰ کے حضور دعا پیش کرتے ہیں:

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے
موجِ بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینہ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینہ ما

اس دعائیہ بند میں اقبال نے چار مصرعوں میں خدا سے جو دعائیں کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مسلمان قوم کو کس مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس بے مایہ قوم کے حق میں خدا سے دعا کر رہے ہیں کہ اسے حضرتِ سلیمانؑ سے نسبت ہے جن کی حکومت پوری دنیا پر قائم تھی۔ خدا تعالیٰ اس قوم کو ایک بار پھر جہانبانی کا یہی اعزاز عطا کر دے۔ اس خصوصی اعزاز کی حق دار وہ قوم ہوتی ہے جس میں محبت والفت کا جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔ اسی لیے اقبال نے خدا سے دعا کی ہے کہ اس نایاب جنس کو عام کر دے۔ لوگوں کے دلوں میں عشق خدا، عشق رسولؐ اور عشق مومن کی آگ بھڑکا دے اور ہندوستان کے مسلمان جو عملی اعتبار سے بت پرست ہو گئے ہیں، انھیں سچا مسلمان بنا دے۔ چار دعائیہ مصرعوں کے بعد اقبال ایک بار پھر اپنی دلی کیفیت کو دوہراتے ہیں کہ مسلمانوں کے دل میں صرف حسرت ہی حسرت ہے اور ان سے خون یعنی مایوسی کی نہریں جاری ہیں۔ سینوں میں سیکڑوں نشتروں کا کاری زخم ہے جس کے سبب نالہ وفریاد کی صدائیں نکل رہی ہیں۔ گویا شاعر نے شکوے کے اختتامی بند میں اتمامِ حجت کے طور پر پھر یہ بات دوہرادی کہ سینوں میں لگے نشتر آہ وبکا کا سبب بنے ہیں۔ یہاں پہنچ کر شکوہ ختم ہو جاتا ہے، لیکن نظم جاری رہتی ہے۔

اگلے چار بند میں اقبال خود سے مخاطب ہو کر کہیں افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور کہیں امید کا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ کہیں مسلمانوں نے خود قوم سے غداری کی اور غیروں کو ایسے رازوں میں شریک کر لیا جن سے اسلام کو نقصان پہنچا۔ میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگوں کی بدولت اسلامی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور ایک ایک کر کے شیدائیانِ اسلام ختم ہوتے چلے گئے۔ یہاں اقبال نے تعلّی کے طور پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ سارے باغ میں اب صرف ایک بلبل یعنی اقبال ہی باقی رہ گیا ہے جو اپنے نغموں سے قوم کو بیدار کرنے کے مشکل کام میں لگا ہے۔ انتیسویں بند میں شاخِ صنوبر سے قمریوں کے گریزاں ہونے کی بات رہنماؤں کے خدمتِ قوم سے کنارہ کرنے کا کنایہ ہے۔ پھول کی پتیوں کا جھڑ کر پریشاں ہونا لیڈروں کی خودغرضی کے سبب قوم کے افراد میں پھوٹ پیدا ہونے کا کنایہ ہے۔ باغ کی پرانی روشوں کے ویراں ہونے سے مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کا خاتمہ مراد ہے۔ پیرہن سے ڈالیوں کے بے بہرہ ہونے سے مراد مسلمانوں کا علوم وفنون سے بے بہرہ ہونا ہے، البتہ اقبال کا معاملہ جدا ہے:

قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

گلشن میں اقبال کی فریاد سمجھنے والا کوئی نہیں اسی لیے نہ جینے میں لطف رہا ہے نہ مرنے میں۔ دن رات قوم کی بے حسی شاعر کو خون رلاتی ہے۔ جو جذبات اور احساسات اس کے سینے میں جاگزیں ہیں وہ ظہور کے لیے بے تاب ہیں، لیکن ان کی قدر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے اقبال نظم کے آخری بند میں بھی ایک بار پھر دعائیہ لب ولہجہ اختیار کر کے خدا سے کلام میں ایسی تاثیر طلب کرتے ہیں جو مسلمانوں کے دلوں کو متاثر کر سکے۔ اقبال کی خواہش ہے کہ اس عہد میں ان کا کلام بیداری کا نقیب ثابت ہو اور کلام اقبال کا مطالعہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام اور قرآن کی محبت موجزن کرنے کا سبب بنے۔ انھیں یہ احساس ہے کہ اس پیغام کا ظہور سرزمین عرب نہیں عجم یعنی غیر عرب سے ہوا ہے، لیکن شاعر کو فخر ہے کہ اس کا پیغام وہی ہے جو سرزمین عرب سے نمودار ہو کر پورے عالم پر چھا گیا تھا۔ اسی غلبۂ اسلام کی خواہش نے اقبال کو آمادہ کیا کہ وہ اس امید افزا خیال پر اپنی نظم تمام کر دیں:

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

یہ نظم ایک طویل مکالمہ ہے اس لیے خطابت کا رنگ ہر جگہ نمایاں ہے۔ پہلے بند کے پہلے ہی مصرعے میں اقبال نے نظم کا مزاج، لے اور آہنگ طے کر دیا ہے۔ نظم واشگاف الفاظ میں بغیر کسی تمہید کے پے در پے سوالات سے شروع ہوتی ہے۔ اقبال جلد از جلد اصل مدعے کی طرف آنا چاہتے ہیں۔ بند کے ابتدائی چار مصرعوں میں چار سوال کیے جاتے ہیں اور پھر اگلے دو مصرعوں میں شاعر یہ اعلان کر دیتا ہے کہ تابِ سخن اسے جرأت آموزی پر آمادہ کر رہی ہے اس لیے وہ یہ شکوہ کرنے کا حوصلہ کر رہا ہے۔ مذکورہ بند کی پہلی قرأت سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ شاید پہلے مصرعے سے شکوہ شروع ہو گیا ہے اور شاعر زیاں کار اور سود فراموش بنے رہنے سے انکار کر رہا ہے، لیکن چوتھے مصرعے تک پہنچتے پہنچتے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کسی ہم نوا کو مخاطب کیا ہے۔ یہ ہم نوا خود شاعر ہو سکتا ہے اور اس کے عہد کے دیگر افراد بھی۔ تیسرے مصرعے میں اس نے کسی بلبل کے نالے سنتے رہنے اور ہمہ تن گوش رہنے پر بھی اعتراض کیا ہے۔ یہ بلبل کون ہے؟ ذرا غور وفکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ بلبل خود شاعر ہے۔ اس خیال کو تقویت ملتی ہے نظم کے اٹھائیسویں بند سے جس میں اقبال نے خود کو ایک بلبل کہا ہے جو محوِ ترنم ہے اور جس کے سینے میں نغموں کا تلاطم برپا ہے:

ایک بلبل ہے کہ ہے محو ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

نظم کا فن جس ارتباط کا تقاضا کرتا ہے وہ اس نظم 'شکوہ' میں نظر آتا ہے کہ نظم خود کلامی سے شروع ہوئی تھی اور خود کلامی پر ختم ہوئی۔ نظم کی ابتدا میں جس بلبل کا ذکر آیا اس کا اعادہ آخری بند سے کچھ پیشتر کر دیا گیا اور پھر آخری بند میں تعلّی کے سے انداز میں اقبال نے لکھا:

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں

اقبال کو اپنے فن کی بلندی کا قوی احساس ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انھیں اظہار کی غیر معمولی صلاحیت عطا ہوئی ہے۔ اس لیے خود کو بلبل تنہا قرار دینا محض شاعرانہ تعلّی سے آگے بڑھ کر ایک قرارِ واقعی دعویٰ بن جاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر شاعر نے فخر و سرشاری کے اس پہلو کی بھی صراحت کر دی ہے کہ وہ عجمی خم میں حجازی مے پیش کرنے اور ہندی نغمے کو حجازی لے میں بیان کرنے کا ہنر بھی جانتا ہے۔

عجم، حجاز، ہند، خم، مے، نغمہ، لے محض دو مصرعوں میں استعاروں کا ایسا بھرپور التزام ہے کہ ہر لفظ اپنے اصل معنی سے بلند ہو کر نئے معنی کی جستجو کرتا ہے۔ یہ نئے معنی نئے ہونے کے باوجود دور از کار نہیں ہوتے کہ قاری ان میں اُلجھ کر رہ جائے۔ یہ اتنے پرزور اور قوی ہوتے ہیں کہ قاری ان لفظوں کے روایتی معنی مراد لے ہی نہیں سکتا۔ اس کا ذہن فوراً اُن معنی تک رسائی کراتا ہے جو اقبال کو مقصود ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالؔی نے استعارے کو دلوں کو تسخیر کرنے والا کارگر منتر قرار دیا تھا۔ مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> استعارہ بلاغت کا ایک رکن اعظم ہے اور شاعری کو اس کے ساتھ وہی نسبت ہے جو قالب کو روح کے ساتھ۔ کنایہ اور تمثیل کا حال بھی استعارہ ہی کے قریب قریب ہے۔ یہ سب چیزیں شعر میں جان ڈالنے والی ہیں جہاں اصل زبان کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے وہاں شاعر انہی کی مدد سے اپنے دل کے جذبات اور دقیق خیالات عمدگی کے ساتھ ادا کر جاتا ہے اور جہاں اس کا اپنا منتر کارگر نہیں ہوتا وہاں انہی کے زور سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔

اقبال دلوں کو تسخیر کرنے کا یہ ہنر جانتے ہیں۔ انھیں تخلیقی سطح پر استعارے کی توانائی کا علم ہے۔ وہ فطرت کی اس عظیم نعمت کو اپنی گراں مایہ تخلیقی قوت سے لفظی اور معنوی دونوں سطح پر اعلیٰ مقام عطا کرتے ہیں۔ وہ پرانے استعاروں میں معنی کے نئے رنگ بھر دیتے ہیں اور نئے استعاروں میں مطلوبہ معنی۔ چمن، بوئے گل، پھول، ڈالی اور زمزمہ پرداز، یہ وہ الفاظ ہیں جو ہماری روایتی شاعری میں روایتی استعاراتی نظام کے حامل رہے ہیں، لیکن اقبال کے کلام میں یہ الفاظ بالکل نئے اور مختلف معنوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں:

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن

عہدِ گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال کی الم ناک داستان کو گل اور چمن کی پرکیف لفظیات کے پردوں میں بیان کرنا غیر معمولی ہنرمندی کا ثبوت ہے۔ غدارانِ قوم کے لیے بوئے گل کا استعمال کہ انہی کے ہاتھوں چمن کے راز بیرونِ چمن گئے اور پھر انہی غداروں کے لیے لفظ پھول کا استعمال کہ یہی پھول غمازِ چمن بھی ہیں۔ پھر عہدِ گل یعنی مسلمانوں کے دورِ حکومت کا خاتمہ، سازِ چمن یعنی سلطنت اسلامیہ کا تاراج ہو جانا اور زمزمہ پرداز یعنی رہنمایانِ قوم کا سلسلۂ رہنمائی ترک کر دینا۔ ہر لفظ ایک استعارہ ہے پرزور اور قوی۔ ہر لفظ تیار ہے اقبال کے ہاتھوں اپنے نئے معنی اختیار کرنے کے لیے۔ وہ اپنے روایتی لغوی معنی ترک کر کے مطلوبہ معنی کی ترسیل کے لیے نیا رنگ روپ اختیار کرنے کو پوری طرح آمادہ ہے۔ اقبال لفظوں میں روح پھونکتے جاتے ہیں اور ایک نئے سیاق کی تخلیق کرتے ہیں جس سے نیا استعارہ جنم لیتا ہے۔ نظم شکوہ میں ایسے سیکڑوں استعاروں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جو اقبال کے ذہن کی بھٹی سے اپنے معنی لے کر نمودار ہوئے ہیں اور قاری تک انہی معنی کی رسائی کرتے ہیں جو اقبال کو مطلوب ہیں۔ لفظ کی حیثیت ایک سمندر کی سی ہوتی ہے جس میں معنی کی ایک کائنات بند ہوتی ہے۔ اقبال اُس کائنات کے اسرار کھولتے ہیں۔ وہ نہ صرف نئے موضوعات، نئی فکر اور نئی اقدار کو پیش کرتے ہیں بلکہ شاعری اور زبان کو بھی نئے الفاظ عطا کرتے ہیں۔ نئی تشبیہیں، نئی علامتیں وضع کرتے ہیں۔ لفظوں کو زندگی عطا کرتے ہیں:

وادیِ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا
قیس دیوانۂ نظارہ محمل نہ رہا

حوصلے وہ نہ رہے، ہم نہ رہے، دل نہ رہا
گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا

پرانے استعاروں اور علامتوں کو تو اقبال نے معنی کا نیا روپ دیا ہی، ساتھ ہی ہماری روایتی تلمیحات کو بھی اس طور برتا ہے کہ وہ مردہ استعارے سے زندہ استعارہ بن گئی ہیں۔ لیلیٰ و قیس کی تلمیح ہو یا وادیِ نجد کی، سرفاراں پر دین کو کامل کرنے کی تلمیح ہو یا رسمِ سلمانؓ و اویس قرنیؓ کی، سب کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ محمود و ایاز کی تلمیح کو اس طور پر برتا ہے کہ یہ زبان زدِ خاص و عام ہو گئی ہے۔

خطیبانہ لہجے کے باوجود نظم میں کہیں بھی شعریت کم نہیں ہوتی۔ ہر شعر میں ہر مصرعے میں جذبے اور احساس کی کارفرمائی ہے۔ طویل مکالمہ ہونے کے باوجود نظم کی تاثیر کہیں ماند نہیں پڑتی۔ ایک موقع بھی ایسا نہیں آتا کہ قاری اکتاہٹ محسوس کرے۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے جیسے کسی سحر میں گرفتار ہو اور اس تجسس میں مبتلا کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔ یہی آفاقی شاعری کی پہچان ہے اور اقبال کی یہ نظم ہر دور میں آفاقی مقبولیت کی حامل رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

○○